بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پروفیسر خورشید احمد

ریاست جموں و کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کے خلاف چلنے والی تحریک آج ایک بڑے ہی نازک اور فیصلہ کن دور میں داخل ہو گئی ہے۔ تحریکِ آزادیِ کشمیر کوئی نئی تحریک نہیں۔ اس کا آغاز ۱۹۳۱ میں ڈوگرہ راج کے خلاف عوامی جدوجہد سے ہوا۔ ۱۹۴۷ میں یہ تحریک ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ ہندوستان نے ڈوگرہ مہاراجہ اور برطانوی سامراج کے' اور خصوصیت سے اس کے نمائندوں ریڈ کلف اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تعاون سے' اور ننگی فوجی قوت کے ذریعے' ریاست کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب عوامی جدوجہد کا دباؤ بڑھا تو ہندوستان نے اقوامِ متحدہ کا سہارا لیا اور استصواب کا وعدہ کر کے جنگ بندی کرائی۔ لیکن آج تک ریاست کے شہریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم رکھا۔

ریاست کے مسلمان ایک مدت تک یہ امید لگائے رہے کہ ان کی قسمت کا فیصلہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہو جائے گا۔ انھیں یہ امید بھی تھی کہ بڑی طاقتیں اور پاکستان ان قراردادوں پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگوں سے بھی ان کو یہ توقع تھی کہ شاید کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے۔ لیکن ان تمام امکانات سے مایوس ہو کر مقبوضہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں نے ایک آخری کوشش مسلم متحدہ محاذ کے جھنڈے تلے ۱۹۸۷ کے انتخاب کے ذریعے کی۔ اس انتخاب میں جس درجے کی دھاندلی ہوئی اس نے بیلٹ بکس کے ذریعے تبدیلی کے امکان سے عوام کو مکمل طور پر مایوس کر دیا' جس کا اظہار ۱۹۸۹ کے انتخابات کے مکمل بائیکاٹ کی شکل میں کیا گیا۔ اس انتخاب کا ۹۷ فیصدی افراد نے بائیکاٹ کیا' جو ایک طرف ہندوستان کے غاصبانہ اقتدار کے خلاف ایک ریفرنڈم تھا اور دوسری طرف

تحریک کی حکمتِ عملی میں ایک انقلابی تبدیلی کے لیے فیصلہ کن موڑ بن گیا۔ اب بیلٹ کی بجائے بلٹ (گولی) کے ذریعے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا گیا۔ ۱۹۹۰ سے جموں و کشمیر کے مسلمانوں نے ہندوستان کے استعماری چنگل سے آزادی کے لیے وہی راستہ اختیار کیا ہوا ہے جسے الجزائر میں مسلمان عوام نے ۱۹۶۰ کی دہائی میں فرانس کے سامراج کے خلاف استعمال کیا تھا اور جو اس وقت سے استعماری طاقتوں کے خلاف آزادی کی تحریک کا مؤثر ترین ہتھیار رہا ہے۔

آج اگر مسئلہ کشمیر اجاگر ہوا ہے' اور اسے عالمی پیمانے پر ایک بار پھر شنوائی حاصل ہو رہی ہے' تو یہ اس جہادی تحریک کی وجہ سے ہے جو اہلِ کشمیر نے اپنے حقِ آزادی کے حصول کے لیے برپا کی ہوئی ہے۔ گذشتہ چار سال سے کشمیر کے نوجوان اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے جہادِ آزادی کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ موجودہ مرحلے کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ مسلمانانِ کشمیر کی ہمہ گیر جہادی تحریک نے مقبوضہ کشمیر کے طول و عرض میں ہندوستان کے اقتدار کی چولیں ہلا دی ہیں اور چند ہزار سرفروشوں کی جدوجہد نے ہندوستان کی ۶ لاکھ فوج کو ریاست پر ہندوستان کی حکمرانی کو قائم رکھنے میں ناکام کر دیا ہے۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے ہندوستان نے اپنی عسکری قوت کا بڑا حصہ کشمیر میں جھونک دیا ہے' ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے' ریاستی تشدد کا دور دورہ ہے' انسانی حقوق ہر گلی اور ہر بازار میں پامال ہو رہے ہیں' بوڑھے' بچے' عورتیں نشانۂ ستم بن رہے ہیں' علاقے کے علاقے ایسے ہیں جہاں ۱۲ مہینے کرفیو کا راج رہتا ہے' گاؤں کے گاؤں اور محلے کے محلے نذرِ آتش کیے جا رہے ہیں' معصوم عورتوں کی آبروریزی بلکہ اجتماعی عصمت دری ریاستی ظلم کا ایک گھناؤنا اسلوب بن گئی ہے' لیکن ظلم کا تازیانہ تحریکِ آزادی کے لیے مہمیز کا کام کر رہا ہے۔

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

آج جب کشمیر کے عوام اپنے خون کی زبان سے ہندوستان کے ظالمانہ سامراج سے آزادی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مانگ رہے ہیں' اور اس کے لیے بے مثال قربانیاں پیش کر رہے ہیں' سوچنے کا اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان' اس کے عوام اور حکومت کہاں تک اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ مسئلہ کے تاریخی تناظر اور مستقبل کے امکانات کی روشنی میں اس سوال پر غور کرے' اللہ رب العزت اور مسلمانانِ جموں و کشمیر کے سامنے اپنی تاریخی جواب دہی کو سمجھے' اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ تاریخ میں

ایسے فیصلہ کُن مواقع روز روز نہیں آتے۔ اگر ہماری غفلت سے یہ تاریخی موقع ضائع ہو گیا تو بہ حیثیت قوم ہمارے لیے دنیا میں تباہی اور آخرت میں رسوائی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ اور اگر ہم نے وقت کے اس چیلنج کا بھرپور جواب دیا تو ان شاء اللہ برصغیر کا نقشہ بدل جائے گا۔

سب سے پہلے جس بات کو واضح ہو جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ دراصل خود پاکستان اور اہلِ پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ بلاشبہ ظلم جہاں بھی ہو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھائے اور مظلوم کی مدد کرے۔ اور اگر یہ ظلم اس کے اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں پر ہو رہا ہو تو اس کا فرض ہے کہ اور بھی ہمت اور مستعدی کے ساتھ مظلوموں اور مستضعفین کی مدد کرے۔ اور اگر یہ آگ خود اس کے اپنے گھر میں لگی ہو اور اس کے اپنے جگر گوشے مشقِ ستم بن رہے ہوں تو پھر اس کی ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کشمیر میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں اہلِ پاکستان کی ذمہ داری ہر تین پہلوؤں سے ہے۔

کشمیر، جیسا کہ قائداعظمؒ نے فرمایا، ہماری اپنی شہ رگ ہے۔ ایک قوم کے لیے اس سے بڑی غفلت کون سی ہو سکتی ہے کہ اس کی شہ رگ پر دشمن کا قبضہ ہو اور اسے پھر بھی چین کی نیند آتی ہو؟

مسئلہ کشمیر کے بارے میں دوسری حقیقت یہ سامنے رہنی چاہیے کہ پاکستان کی حیثیت اس معاملے میں ایک بنیادی فریق کی ہے، محض ایک تماشائی کی نہیں! کشمیر کا سب سے پہلا قانونی رشتہ پاکستان سے قائم ہوا۔ آزادی کے حصول کے ساتھ ۱۴ اگست کو ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کے درمیان ایک عبوری معاہدہ (stand still agreement) ہوا، جس کی رو سے وہ تمام امور، خصوصیت سے راہ داری، مواصلات، ڈاک، بجلی وغیرہ جو پہلے سرکارِ برطانیہ کے ذریعے انجام پاتے تھے، اس معاہدہ کے بعد پاکستان کے ذریعے انجام پانے لگے۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو جس طرح پاکستان کی عمارتوں پر پاکستانی پرچم لہرایا اسی طرح کشمیر کے ان محکموں پر بھی پاکستانی پرچم بلند ہوا اور وہاں کے سرکاری ملازمین نے پاکستان سے وفاداری کا رشتہ استوار کیا۔ اس انتظام پر ضرب ہندوستان کی فوج کشی سے پڑی اور تنازعہ کشمیر نے جنم لیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان کی افواج میں سرزمینِ کشمیر پر جنگ ہوئی۔ بالآخر اقوامِ متحدہ نے استصواب کے وعدے پر جنگ

بندی کرائی۔ جنگ بندی کی یہ قرارداد (ریزولیوشن ۴۷ آف ۱۹۴۸) بلیجیئم' چین' کولمبیا' کینیڈا' برطانیہ اور امریکہ نے مشترکہ طور پر پیش کی اور پاکستان اور ہندوستان نے اسے منظور کیا۔

اس پس منظر کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کے چار فریق ہیں۔ پاکستان' ہندوستان' اقوامِ متحدہ اور سب سے اہم ریاست جموں و کشمیر کے عوام جنھیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ نہ یہ مسئلہ محض ہندوستان کا داخلی مسئلہ ہے اور نہ ہی اس کا تعلق محض پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کسی سرحدی تنازعے سے ہے۔ اصل مسئلہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا ہے جسے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں وہاں کے عوام کو اپنی آزاد مرضی اور بین الاقوامی نگرانی میں منعقد کیے جانے والے استصواب کے ذریعے طے کرنا ہے۔ یہ ان کا حق ہے کہ وہ طے کریں کہ ان کی ریاست کا الحاق پاکستان سے ہو یا ہندوستان سے' نیز اس الحاق کے بعد وہاں کا مستقل نظامِ حکومت کس شکل میں اور کس انداز میں مرتب کیا جائے۔ اصل مسئلہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے وعدوں کے مطابق حقِ خودارادیت کا مسئلہ ہے۔ اور جب تک اس مسئلے کو حل نہیں کیا جاتا' کشمیر کا مسئلہ پیچیدہ تر ہوتا جائے گا۔ جس اسکیم پر برصغیر پاک و ہند کو آزادی ملی اور دو مملکتیں وجود میں آئیں یہ اسی اسکیم اور اسی ایجنڈے کا ایک غیر طے شدہ نقطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استصواب سے ہٹ کر اس کا کوئی قانونی' سیاسی اور اخلاقی حل ممکن نہیں۔

مندرجہ بالا گزارشات کی روشنی میں یہ بات بھی آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کا حصہ نہیں بلکہ ایک متنازعہ علاقہ ہے' جس کے مستقبل کا فیصلہ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہونا باقی ہے۔ ہندوستان مستقل طور پر یہ مغالطہ دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ "کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے۔" لیکن صفحۂ ہستی پر اس سے بڑا جھوٹ ممکن نہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندوستان آزاد ہوا' اس وقت کشمیر اس کا حصہ نہ تھا۔ قانونی طور پر ہندوستان کے دعوے کی بنیاد اس وثیقۂ الحاق پر رکھی جاتی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ اس پر ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ کو مہاراجہ ہری سنگھ نے دستخط کیے۔ آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وثیقہ کے بارے میں بھی چند پہلو واضح کر دیے جائیں۔

(الف) مہاراجہ کے خلاف پوری ریاست میں بغاوت کی تحریک چل رہی تھی۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس دونوں ہی اس کے خلاف تھیں' اور اس پر سب کا اتفاق تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا

فیصلہ مہاراجہ نہیں وہاں کے عوام کی مرضی سے ہونا چاہیے۔

(ب) مہاراجہ کا اقتدار ڈانواں ڈول تھا۔ اس کا حکم غیر مؤثر تھا اور وہ دارالخلافہ یعنی سری نگر کو چھوڑنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ خود شیخ عبداللہ نے اپنی سوانح عمری "آتشِ چنار" میں تسلیم کیا ہے کہ

> اِدھر یہ حالات رونما ہو رہے تھے اُدھر مہاراجہ نے بوریا بستر باندھ کر اپنے جواہرات اور دیگر قیمتی اثاثہ کو صندوقوں میں بند کر کے ایک سو سے زیادہ گاڑیوں میں لاد دیا اور خود اس بھگوڑے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے ۲۵ اکتوبر کو جموں کی جانب کوچ کر گیا۔
> (صفحہ ۴۱۱)

دوسرے الفاظ میں مہاراجہ اس وقت صاحبِ اقتدار نہیں تھا۔ اور بین الاقوامی قانون کا مسلّمہ اصول ہے کہ جس کی گرفت اقتدار پر نہ ہو وہ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی بات طے نہیں کر سکتا۔

(ج) جس دستاویز پر مہاراجہ کے دستخطوں کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس کے بارے میں تازہ ترین تحقیق یہ ہے کہ وہ موجود ہی نہیں۔ نیز یہ کہ ہندوستانی فوجیں دراصل کسی بھی دستاویز پر دستخط سے پہلے سری نگر پہنچ گئی تھیں۔ پروفیسر الیسٹر لیمب نے اپنی دو تحقیقی کتابوں میں ناقابلِ تردید وثائق اور شواہد سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی فوجیں ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ کو کشمیر میں پہنچ گئیں' جبکہ مہاراجہ سے زبردستی جو دستخط حاصل کیے گئے وہ ۲۷ اکتوبر سے پہلے حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جس دستاویز کو وثیقۂ الحاق کہا جاتا ہے وہ محض ایک پروفارما ہے جس سے کوئی چیز حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ اگر مہاراجہ کے اس خط کو بھی سامنے رکھا جائے جو اس وقت لکھا گیا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ الحاق کا فیصلہ نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنی پوزیشن سنبھالنے کی شرائط پیش کر رہا تھا۔ پروفیسر لیمب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ آج تک کسی بین الاقوامی فورم پر اس اصل دستخط شدہ وثیقہ کو پیش نہیں کیا گیا۲ے۔ اس تحقیق کے صحیح ہونے پر شبہ کی کوئی گنجائش نہیں' اور اس طرح ہندوستان کے دعوے کی ساری قانونی بنیاد ہی بادر ہوا ہو جاتی ہے

ع وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

(د) پھر یہ بات تو ہر حیثیت سے اور ہر ایک کے نزدیک مسلّم ہے کہ یہ ایک وقتی اور عارضی انتظام تھا جس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی۔ اصل فیصلہ ریاست کے عوام کے آزادانہ استصواب کے ذریعے ہونا تھا جو ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

خود شیخ عبداللہ لکھتے ہیں کہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے الحاق منظور کرتے ہوئے یہ مشہورِ زمانہ شرط لگا دی' جس نے بعد میں کشمیر کے سوال کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا۔ انھوں نے مہاراجہ کو لکھا: "جن مخصوص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کے پیش نظر میری حکومت ہندوستانی ڈومینین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو اس اصول کے تحت قبول کرتی ہے کہ جس ریاست کے الحاق کا مسئلہ ما بہ نزاع ہو وہاں الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہو۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جوں ہی امن و امان بحال ہو اور حملہ آوروں سے ریاست کو نجات ملے' تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے سے طے کیا جائے۔۳۔

پنڈت نہرو نے جب ۱۹۵۴ میں آئین ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی تو خود شیخ عبداللہ نے ان کو یہ جواب دیا:

جواہر لال نے پھر اپنی بات دہرائی تو میں نے ان کی خواہش کی تکمیل کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اب یہ میری باری تھی' جواہر لال کا حافظہ تازہ کرانے کی اور انھیں یہ یاد دلانے کی کہ کشمیر میں رائے شماری کرانے کے سلسلے میں ہم ساری دنیا اور کشمیر کے سامنے قول ہار چکے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں اس قدر پابند (Commit) ہو چکے ہیں کہ اب ہم اپنی رسوائی کی قیمت پر ہی اپنے وعدے سے مکر سکتے ہیں۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کرلیں تو دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ مجروح اور اس کی اخلاقی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔... سلامتی کونسل بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گی' پاکستان کے ماننے کی بات تو بہت دور رہی۔ دنیا کی رائے عامہ پاکستان کی ہم نوائی کرے گی۔ خود کشمیری عوام کا آپ پر اعتماد متزلزل ہو جائے گا' اور جس تنازعے کو ختم کرنے کے لیے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ ایک شمشیرِ برہنہ کی طرح ہمارے سروں پر بدستور لٹکتا رہے گا۔۴۔

آج ۴۶ سال کے بعد یہ شمشیرِ برہنہ ہندوستان کے سر پر لٹک رہی ہے اور عالمی رائے عامہ کو یاد دلا رہی ہے کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور جب تک وہاں کے عوام اپنی آزاد مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ نہ کرلیں کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ فرار کا ہر راستہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔

کشمیر کے بارے میں ہندوستان جس تضاد بیانی کا شکار ہے اسے ہندوستان کے مشہور صحافی کلدیپ نیّر نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے:

وزیراعظم نرسمہاراؤ نے یومِ آزادی پر لال قلعہ کی بلندیوں سے ارشاد فرمایا کہ "کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔" پھر چند ہی ماہ بعد پاکستان کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو لکھا کہ "بھارت کشمیر کے بارے میں بات چیت کے لیے تیار ہے۔" جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ موصوف نے یہ مان لیا کہ اس علاقے کے مستقبل کا ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔ کوئی حاکمیتِ اعلیٰ رکھنے والا ملک اپنے کسی علاقے کی حیثیت کے بارے میں بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جب تک وہ علاقہ متنازعہ نہ ہو۔۵

ہندوستان کے ایک نامور قانون دان اور ماہرِ دستورِ ریاست اے۔ جی۔ نورانی (A.G. Noorani) امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی عہدہ دار مسز رابن رافیل اور ان کے پیش رَو جان ایچ کیلے کے ان بیانات کی روشنی میں جو کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ تسلیم کرنے کے باب میں انھوں نے دیے ہیں، لکھتے ہیں:

بعینہٖ یہی بات خود جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں ۷ اگست ۱۹۵۲ کو کہی تھی: "گو الحاق، قانون اور امرِواقع کے اعتبار سے ہو چکا ہے، مگر ایک اور حقیقت بھی مسلّم ہے، گو اس کا کوئی تعلق قانون سے نہیں، یعنی کشمیر کے عوام سے ہمارا عہد--- بلکہ اگر آپ چاہیں تو اسے یوں بھی کہہ لیں، ساری دنیا کے عوام سے ہمارا عہد--- کہ اس الحاق کی توثیق یا تنسیخ یا (ہندوستان سے) باہر نکل جانا، اگر کشمیری عوام کی رائے ہو۔

اسی طرح چند روز قبل یعنی ۲۶ جون کو انھوں نے کہا تھا: "میں اپنے دستور کے مکمل احترام کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ دستور میں کیا کہا گیا ہے، اگر کشمیر کے عوام یہ نہیں چاہتے تو پھر ان پر اس کا اطلاق نہیں ہو گا۔" نیز ایک اور موقع پر (۲ نومبر ۱۹۴۷) انھوں نے اعلان کیا تھا کہ "یہ نئی پالیسی (یعنی عوام کی رائے کا اتباع) کے احترام کا تقاضا تھا کہ ہم نے کشمیر کے وثیقۂ الحاق میں ایک شرط کا اضافہ کیا تھا۔" ماؤنٹ بیٹن کا خط جو اس وثیقہ کا ایک جزوِ لاینفک ہے، اس میں اس شرط کا ذکر بہ حیثیت ایک لازمی حصہ کے ہے۔ اسی نوعیت کی ضمانتیں سر این جی آئنگر نے بھی اس وقت دی تھیں جب دستور میں دفعہ ۳۷۰ کا اضافہ کیا جا رہا تھا (۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹)، سر گرجا شنکر باج پائے نے اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا و پاکستان کو

یہی ضمانت دی تھی (۲۱ نومبر ۱۹۴۹)' اور مسٹر مینن نے اقوامِ متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں یہی گواہی دی تھی (۸ فروری ۱۹۵۷) کہ الحاق صرف عارضی نوعیت کا ہے۔ یہی عارضی نوعیت اس وائٹ پیپر پر بھی بیان کی گئی ہے جو حکومتِ ہندوستان نے شائع کیا تھا (۱۹۴۸)۔ اس عہد و پیمان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں آج ۱۹۹۳ میں ان پر آج کی صورتِ حال کی روشنی میں عمل ہونا چاہیے۔" ۶۔

اے۔ جی نورانی اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ نہرو نے لیاقت علی خاں سے اپنی خط و کتابت میں مسئلہ کشمیر کو ایک عالمی مسئلہ (International problem) تسلیم کیا تھا اور ۲۶ فروری ۱۹۵۵ کو مسٹر لکشمی چرن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لوک سبھا میں اعلان کیا تھا کہ محض کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کی قرارداد سے یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکتا۔ پنڈت نہرو کے الفاظ تھے "اس نوعیت کا مسئلہ محض یک طرفہ طور پر طے نہیں کیا جا سکتا۔" (A question like this can not be solved unilaterally.) اور پھر صاحبِ مقالہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ انھی پنڈت نہرو نے اپریل ۱۹۵۶ میں کشمیر کے مسئلے کو یک طرفہ حل کرنے کا اعلان کر ڈالا۔ نورانی لکھتے ہیں:

وہ (یعنی پنڈت نہرو) چاہتے تھے کہ دنیا اس مسئلے کو' جسے ۸ جولائی ۱۹۴۹ میں خود انھی نے ایک عالمی مسئلہ (A world question) کہا تھا' اب اس کے یک طرفہ حل کو قبول کر لے اور بس خاموش ہو جائے۔ لیکن دنیا نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ ۷۔

یہی بات مشہور سیاسی لیڈر جے پرکاش نرائن نے ۱۹۶۴ میں کہی تھی:

یہ بات لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہم نے جو عہد کیا تھا وہ محض پاکستان سے نہیں تھا' یہ عہد تو کشمیر کے عوام سے تھا۔ پاکستان کی خطاؤں کی سزا کشمیری عوام کو دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ ان تمام امور کی روشنی میں میری نگاہ میں اس معاملے میں مبنی برحق اور تعمیری سوچ یہی ہے کہ کشمیر کے عوام کو ان کے حقِ خودارادی سے محروم نہ کیا جائے۔ نہ یہ ہی درست ہے کہ ہم یہ کہیں کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کر چکے ہیں یا ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ اب اس حق کا استعمال غیر منطقی اور ناقابلِ عمل ہے۔ ہم چاہے کتنے ہی زور سے یہ بات کہیں کہ ہندوستان سے کشمیر کا الحاق مستقل اور ناقابلِ تنسیخ ہے' دنیا اسے ہرگز تسلیم نہیں کرے گی۔ ۸۔

جے پرکاش نرائن کا ایک خط جو ۲۳ جون ۱۹۶۶ء کو اندرا گاندھی کو لکھا گیا تھا اور جسے ایک ہندوستانی دانشور و صحافی ایم۔ جے۔ اکبر نے اپنی کتاب Kashmir Behind the Vale میں نقل کیا ہے۔ ہندوستان کے سوچنے سمجھنے والے طبقات کے اضطراب اور ان کے ضمیر کی کسک کا غماز ہے۔

جے پرکاش نرائن لکھتے ہیں:

> ہم جمہوریت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن کشمیر پر محض طاقت کے بل بوتے پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سیکولرزم کی بات کرتے ہیں، لیکن ہندو قوم پرستی کو موقع دیتے ہیں کہ ہمیں مجبور کرے کہ تشدد کے ذریعے اس کا تسلط قائم ہو۔ کشمیر کی وجہ سے ہر دوسری چیز سے زیادہ دنیا میں ہمارا وقار مجروح ہوا ہے۔ دنیا میں کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے، بشمول روس، جو ہماری کشمیر پالیسی کو پسند کرتا ہو، خواہ ان میں کچھ، دوسری وجوہ سے ہماری تائید ہی کیوں نہ کر دیتے ہوں، مسئلہ کشمیر زندہ ہے اور اس لیے نہیں کہ پاکستان اسے ہم سے چھین لینا چاہتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہاں کے عوام کے دلوں میں گہری اور ہمہ گیر بیداری اور بے اطمینانی ہے۔۹

ہماری اب تک کی معروضات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے، ریاست جموں و کشمیر آج بھی اسی طرح ایک متنازعہ علاقہ ہے جس طرح ۱۹۴۷ میں ہندوستان کی فوج کشی کے وقت تھا اور اہلِ کشمیر کی حالیہ جدوجہد نے ایک بار پھر اس مسئلے کو ایسی قوت سے زندہ کر دیا ہے کہ اب اس کے مستقل حل کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں ہے، اور مسئلے کا مستقل اور حقیقی معنوں میں جمہوری حل صرف استصواب رائے ہے۔

مسئلہ کشمیر کی اس نوعیت کے واضح ہو جانے سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں جو تحریک برپا ہے وہ دراصل آزادی اور حقِ خودارادیت کی تحریک ہے۔ اسے علیحدگی پسندی کی تحریک کہنا ایک صریح ظلم اور غلط بیانی ہے، اور دہشت گردی قرار دینا اس سے بھی بڑا جھوٹ اور ظلم۔ اس لیے کہ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ اپنے دفاع میں اور اپنی آزادی کے حصول کے لیے اگر باقی تمام راستے بند کر دیے گئے ہوں، تو مسلّح جدوجہد کی جا سکتی ہے، خصوصیت سے جہاں حکومت جبر اور قوت کا استعمال کر رہی ہو وہاں اپنی آزادی کے حصول کے لیے استعماری قوتوں کا مقابلہ انھی کے ہتھیاروں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس حق کا اشارہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں بھی موجود

ہے۔ خود غیر جانبدار تحریک (NAM) کے اعلانات میں افراد کے خلاف تشدد' ریاستی تشدد اور آزادی کی جدوجہد کو ایک دوسرے سے ممیز کیا گیا۔ بقول ڈیوڈ راپو پورٹ:

> دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد وہ متشدد (terrorists) جو سامراجی قوت کے خلاف آزادی کی جدوجہد کر رہے ہوں ان کو "تشدد پسند" نہیں بلکہ آزادی کے مجاہد (freedom fighters) کہا جانے لگا۔ حتیٰ کہ مغرب میں بھی ان کے لیے یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔۱۰

یہی وجہ ہے کہ الجزائر کے انقلاب نے جو نمونہ پیش کیا اگلے تیس سال تک اسی پر سامراج دشمن تحریک بڑھتی رہی۔ تنظیمِ آزادیِ فلسطین کو اقوامِ متحدہ میں آبزرور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جنوبی افریقہ میں اے این سی کی جدوجہد کو عالمی تائید حاصل ہوئی۔ مجاہدینِ افغانستان کو حریت کا نقیب قرار دیا گیا۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی (۱۹۷۲) میں "سیاسی تشدد" کو زیرِ بحث لایا گیا تو تشدد کی کسی ایک تعریف پر اتفاق نہ ہو سکا اور ارکان کی ایک نمایاں تعداد نے اس جدوجہد کو' خواہ اس میں بظاہر تشدد کا پہلو بھی موجود ہو' جو ایک مبنی برحق سیاسی نصب العین مثلاً حقِ خودارادیت کے لیے کی جائے' سیاسی تشدد ماننے سے انکار کر دیا۔۱۱

کشمیر میں برپا جہادِ حریت' حقِ خودارادی کی تحریک ہے۔ اسے نہ علیحدگی پسندی کی تحریک کہا جا سکتا ہے اور نہ معروف معنی میں تشدد اور دہشت گردی کی تحریک۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ تحریک خالص عوامی تحریک ہے۔ اسے مقبوضہ کشمیر کے عوام کی ہمہ جہتی تائید حاصل ہے۔ یہ کوئی باہر سے درآمد شدہ تحریک نہیں ہے۔ پھر یہ تحریک نتیجہ ہے ہندوستان کی ظالمانہ اور آمرانہ پالیسیوں کا' جن پر وہ گذشتہ ۴۶ سال سے عمل پیرا ہے۔ نیز یہ جدوجہد ایک دن میں کہیں خلا سے نمودار نہیں ہوئی۔ حالات کا کھلی نگاہ سے نظارہ کیا جائے تو اس میں ایک تسلسل اور تدریجی ارتقا معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ تحریک نشیب و فراز سے گزری ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ سے آج تک اس کے تسلسل کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مارچ ۱۹۸۷ اور پھر جنوری ۱۹۹۰ سے یہ اپنے فراز کی طرف مصروفِ عمل ہے اور اس زمانہ میں اس میں وسعت اور گہرائی دونوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جس کے نتیجہ میں آج اسے بلاخوفِ تردید قومی تحریک کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی وہ کونسی پالیسیاں ہیں جن کے نتیجے میں حالات اتنے خراب ہوئے ہیں اور بالآخر

اس تحریک نے ہمہ گیر بغاوت کا روپ دھار لیا ہے۔ نیز یہ بات کہ تحریک بنیادی طور پر داخلی تحریک ہے اور آج مقبوضہ کشمیر کی تقریباً تمام مسلم آبادی ہندوستان اور اس کی حکومت سے بیزار ہے اور اب اسے ہندوستان کے چنگل سے آزادی ہی میں اپنے لیے زندگی اور عزت کا سامان نظر آ رہا ہے۔ ہم ان دونوں پہلوؤں پر صرف ہندوستان کے چوٹی کے دانشوروں اور صحافیوں کے تجزیوں کی کچھ جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر رامیش ٹھاکر' ایک ہندوستانی دانشور جو نیوزی لینڈ کی University of Otago میں ایشین اسٹڈیز کا ڈائریکٹر ہے' مشہور عالمی جریدے فارن افیرز (Foreign Affairs) کے ۱۹۹۲ کے شمارہ میں ہندوستان کی کشمیر پالیسی کے دیوالیہ پن کا اس طرح تجزیہ کرتا ہے:

کشمیر میں امن کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بغاوت کی وہ تحریک نہیں جسے سرمایہ اور اسلحہ اسلام آباد سے مل رہا ہو' بلکہ پالیسی کے میدان میں وہ خلا ہے جو دہلی میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۸ سے کشمیر پر ہندوستان کے تسلط کی تاریخ نے پورے ہند کے لیے بڑے نقصان دہ نتائج پیدا کیے ہیں۔ ہندوستان بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے' لیکن کشمیر پر جبری تسلط اور قبضے نے جمہوریت کے اس دعوے کو بے اثر کر دیا ہے۔ کشمیر میں جمہوری اداروں کو بار بار انتخابی عمل میں در اندازی اور بدعنوانی کے ذریعے تباہ کر دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس ریاست میں کٹھ پتلی حکومت کے سوا کوئی برسراقتدار ہو۔ گذشتہ دو سال میں ہندوستانی حکمرانوں کا دامن کشمیر میں پولیس اور فوج کی ظالمانہ کارروائیوں سے داغدار ہے۔... جس طرح کشمیر کو ہندوستان میں محض طاقت کے بل پر رکھا گیا ہے اس سے خود وفاق کا سارا تجربہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ دہلی کے حکمرانوں نے کشمیر کے عوام کی خواہشات کا کوئی احترام نہیں کیا ہے۔ ہندوستان میں کشمیر کو ضم کرنے کا تجربہ سرکاری خزانہ پر بھی ایک بڑا بوجھ ثابت ہوا ہے۔ گذشتہ دو سال میں ہندوستان کی کشمیر پالیسی کے نتیجے میں ملک کو اخلاقی' معاشی' سیاسی اور بین الاقوامی طور پر خسارہ ہی خسارہ حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۹۰ کی تحریکِ مزاحمت کے نتیجے میں ریاست کا انتظام مفلوج ہو گیا ہے۔ مسئلے کو محض امن و امان اور نفاذِ قانون کا معاملہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ کرفیو' پولیس کی روز افزوں سختیوں اور فوجی اور نیم فوجی قوتوں کے طاقت اور مزید طاقت کے استعمال کے ذریعے علیحدگی پسندوں کو دبانے اور مجبور کرنے کا راستہ اختیار کیا گیا ہے' جس کا

نتیجہ الٹا ہوا ہے۔ یعنی اس کے نتیجے میں علیحدگی پسندی کا رجحان اور بھی قوی ہو گیا ہے اور اسے سوسائٹی کے وسیع دائرے سے مدد و معاون مل گئے ہیں' جن کا مقصد اور ہدف کشمیر کو ہندوستان کے کنٹرول سے آزاد کرانا ہے ۱۲؎۔

مشہور صحافی اور تجزیہ نگار خوشونت سنگھ لکھتا ہے:

ہمارے زیرِانتظام کشمیر میں متعدد انتخاب ہوئے ہیں اور متعدد وزرائے اعلیٰ برسرِاقتدار آئے ہیں۔ لیکن یہ تمام انتخاب کسی حیثیت سے بھی اتنے منصفانہ اور آزادانہ نہ تھے جتنے دوسری ریاستوں میں ہونے والے انتخاب۔ نتیجتاً جو لوگ وزرائے اعلیٰ بنے ان کو عوامی مقبولیت کی حامل قیادت نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا تو دراصل دہلی سے تقرر ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی دہلی نے ان کو نامناسب پایا بیک بینی و دوگوش روانہ کر دیا اور ریاست کو گورنر کے راج تلے لے آیا گیا۔ وہ لوگ جو دریائے جہلم کی وادی کے حسین مقامات پر گئے ہیں یا جنھیں کشمیری مسلمان دوستوں سے ملنے کا موقع ملا ہے وہ اعتراف کریں گے کہ کشمیر کے مسلمان اپنے کو ہندوستانی کہنے سے کتراتے ہیں۔ گو وہ ہندوستانی پاسپورٹ پر سفر کرتے ہیں مگر جب بھی بات کرتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ "تم ہندوستانی" اور جب اپنی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم کشمیری۔" ہم نے وادی میں کروڑوں روپیہ لگایا لیکن وہ تو ایک ایسی کھائی ثابت ہوئی جس کی کوئی تہہ نہ ہو۔ عام آدمی کی زبوں حالی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جب حالات بگڑے تو ہم نے فوج اور نیم فوجی جوان بھیجے تاکہ حالات کو قابو میں کریں۔ وہ ہمیں انسانی حقوق کی پامالی اور جبرو تشدد کا مجرم قرار دیتے ہیں۔ گو ان الزامات میں کچھ مبالغہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس بات کا انکار تو ممکن نہیں کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں تو ہوئی ہیں۔... آیئے حقائق کو تسلیم کریں: پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کشمیری مسلمانوں کی تائید سے مکمل طور پر محروم ہو چکے ہیں اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اخلاقی طور پر ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ ان لوگوں پر اپنے کو محض طاقت کے بل بوتے پر مسلط کریں جو ہم کو نہیں چاہتے۔ اور تیسری حقیقت یہ ہے کہ وادی اتنی چھوٹی ہے اور سیاحوں اور دستکاری پر انحصار کی وجہ سے قطعاً" اس پوزیشن میں نہیں کہ ایک مکمل طور پر آزاد ریاست کی حیثیت سے ترقی کر سکے۔

.... ایک سمجھ دار قوم کی حیثیت سے ہمیں اب طوطے کی طرح یہ رٹ لگانا ترک کر دینا

چاہیے کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے اور مسئلے کا حل صرف شملہ معاہدہ کے تحت ممکن ہے۔ اس تکرار کا حاصل تو صرف گرم گفتاری ہے! اور آخری بات: ہمیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ جو چیز سب سے اہم اور اصل مطلوب ہے وہ وادی کے لوگوں کی خوشی اور اطمینان ہے۔" ۱۳۔

ایم۔ جے۔ اکبر تحریکِ آزادی کے مخالفین میں سے ہیں' لیکن حالات کا جو نقشہ کھینچتے ہیں وہ ملاحظہ کے لائق ہے:

عسکریت کے علمبردار بڑی تیزی سے حاشیہ سے وسط دریا (mainstream) کی طرف بڑھنے لگے اور ایک ایسی تیز رفتاری سے جس کی نہ خود ان کو توقع تھی اور نہ ہی ان کے پاکستانی سرپرستوں کو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۸۹ میں جس حکمتِ عملی پر وہ عمل پیرا تھے وہ یہ تھی کہ سال کے متعین دنوں میں متعین مقامات پر وہ سرگرم تھے اور یہ جانچ رہے تھے کہ ان کی مقبولیت کتنی ہے۔ ہر بار انھیں اپنی مقبولیت کا گراف اوپر ہی جاتا نظر آیا۔ پھر نومبر ۱۹۸۹ کے انتخابات ہوئے۔ اس موقع پر تو ان کے اندازے بھی غلط ثابت ہوئے جو حالات سے مایوس تھے۔ عام انتخابات میں عسکری قوتوں کو مکمل عوامی تائید حاصل ہوئی۔ صرف پانچ فیصد افراد ووٹ دینے کے لیے گئے' باقی نے بائیکاٹ کی پکار کا ساتھ دیا۔ اب حالات اس مقام پر پہنچ گئے تھے جو ڈرامے کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔... ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ تک آزادی کی تحریک کے لیے عوامی تائید ڈھکی چھپی تھی' مکمل اور واضح نہیں تھی۔ جگ موہن کے آنے کے بعد حالات بدل گئے۔ لوگ پہلے تو خائف ہوئے لیکن پھر ہمت کا جوالہ پھوٹا اور خوف کی جگہ اس جرات نے لے لی جو ناامیدی کی پیداوار ہوتی ہے۔ لوگ گلیوں میں جوق در جوق آنے لگے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات عورتوں' بوڑھوں اور بچوں کا طوفان تھا۔ انتظامیہ حواس باختہ ہو گئی' اور گولی چلانے کا حکم دے دیا' پھر کیا تھا۔ مرنے والوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صرف اس دن گوکا دل کے مقام پر پچاس لاشیں تو ٹھنڈی ہو گئیں۔ یہ دن یادگار بن گیا۔ ۱۹ جنوری ایک تاریخی موڑ ہے جس نے تحریک کو عوامی ابھار عطا کیا۔... سری نگر کی ہر مسجد جوش اور جذبے کا ایک قلعہ بن گئی۔ ہر خطبہ علیحدگی کا ناقوس بن گیا۔ لاؤڈ اسپیکر کی آوازوں نے فضاؤں کو بھر دیا اور کیسٹ آزادی کے ترانے الاپنے لگے۔ ہر طرف سے یہی شور تھا: "ہم کیا چاہتے ہیں---

آزادی' آزادی' اللہ اکبر' اللہ اکبر۔

ایم۔ جے۔ اکبر اپنی کتاب کو شیخ عبداللہ کے مزار کی حالت زار پر ختم کرتا ہے:

اس سادہ اور پُروقار مزار کے چاروں طرف آج اسلحہ بردار افراد بیٹھے ہیں۔ پولیس والے فوج کے پورے بارود خانے سے مسلح! شیخ کی زندگی تو پولیس کی نگرانی میں گزری' لیکن موت کے بعد بھی پولیس ہی اس کا گھیرا کیے ہوئے ہے۔ دشمن کس طرح بدلتے ہیں! ہاں اتنی بات تو یقینی ہے' کشمیر کی روح امن و آشتی سے شاد کام کیسے ہو سکتی ہے' جب شیخ محمد عبداللہ کے مزار کی بھی حفاظت کے لیے بندوقوں کا سہارا لینا پڑے۱۴۔

ڈاکٹر منظور عالم کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں اور آج کل ورلڈ بنک کے مشیر ہیں۔ جدہ کے سعودی گزٹ میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

۱۹۸۷ کے انتخابات کے بعد سے کشمیر کے حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ آج کشمیر ہندوستان سے کُلّی طور پر مغائرت کا شکار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کبھی بھی جذباتی طور پر ہندوستان کا حصہ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی ہندوستان کی حکومت نے اسے اپنے سے یک جان کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ گو کشمیر کو مالی معاملات میں ایک خاص حیثیت دی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نارَوا امتیازی سلوک کا نشانہ رہا۔ وہ ریاستیں جن کو خاص حیثیت (special status) حاصل ہے ان کو مرکزی امداد کا ۹۰ فیصدی بطور گرانٹ اور صرف ۱۰ فیصدی بطور قرض ملتا ہے لیکن کشمیر کا معاملہ یہ ہے کہ ۹۰-۱۹۸۹ تک مرکزی حکومت سے جو کچھ کشمیر کو ملا اس کا ۷۰ فیصد بطور قرض اور صرف ۳۰ فیصدی بطور گرانٹ تھا۔ نیز کشمیر سے ہندوستان کی تجارت غیر متوازن ہے جس کے نتیجے میں عملاً کشمیر سے سرمایہ ہندوستان کو منتقل ہو رہا ہے۔

اجیت بھٹا چاریہ لکھتا ہے کہ "نئی دہلی کشمیر کی منتخب قانونی حکومتوں کی قسمت سے کھیلتی رہی اور جس وزیراعظم سے ناخوش ہوئی اس کو گرانے میں لگ گئی۔"

ویر شنگھوی ہفت روزہ سنڈے (۲۶ ستمبر۔ ۲ اکتوبر ۱۹۹۳' ص-۹) میں لکھتا ہے کہ "کتنی کے کشمیری مسلمان ہوں گے جو اپنے کو ہندوستانی سمجھتے ہوں اور ہم نے بھی اہلِ کشمیر کو غیر ہی سمجھا۔ ہم نے حزبِ اختلاف کے قائدین کو جیلوں میں محبوس کیا' انتخابات کو بدعنوانیوں کی نذر کیا' استصواب سے احتراز کیا اور ایک حد تک اس وجہ سے کہ ہم کو یقین نہیں تھا کہ نتیجہ کس رخ پر ہو گا۔"

پاکستان اس وقت کشمیر میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو ہندوستان نے ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کے بنانے میں کھیلا تھا۔ اس وقت پورا مشرقی پاکستان' مغربی پاکستان کے تسلط کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسی طرح آج ہندوستان کشمیر کے مسئلے کو محض لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بنا کر پیش کر رہا ہے' حالانکہ تقریباً کشمیر کی پوری وادی ہندوستانی حکمرانوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کر رہی ہے۔ اس کا اعتراف آر۔ ڈی۔ ساٹھے' سابق سیکرٹری خارجہ نے اپنے ایک حالیہ پریس کے بیان میں کیا ہے۔ انھوں نے حکومتِ ہند کو متوجہ کیا ہے کہ "آج کشمیری مسلمانوں میں ہندوستان کا کوئی دوست باقی نہیں رہا ہے۔ کشمیری مسلمان بڑی شدت سے ہندوستان کے ساتھ رہنے کا مخالف ہے۔ بلکہ اب تو اس کو بندوق کا خوف بھی باقی نہیں رہا۔" (ملاحظہ ہو روزنامہ The Hindu' ۷ ستمبر ۱۹۹۳)۔

کشمیری مسلمانوں کی ہندوستان سے مغائرت اور بے زاری کو جنرل اشوک مہتا ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: "جو اشارے کشمیر کی وادی سے مل رہے ہیں وہ صاف بتاتے ہیں کہ آج وادی میں حکم عسکری نوجوانوں کا چل رہا ہے' ہندوستانی انتظامیہ کا نہیں" (ہفت روزہ Sunday' ۱۶-۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳)۔ وادی کے تمام اہم مقامات' خصوصیت سے سری نگر' سوپور' بارہ مولا' مجاہدین کے قبضے میں ہیں۔ ہندوستانی انتظامیہ سے عوام کی مغائرت مکمل ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہماری یہ پالیسی ہے کہ ہم نے کشمیری مزاحمت کا مقابلہ بس بندوق کی نالی سے کیا ہے۔ کشمیر پر جو بھی بھاری رقوم ہم نے صرف کی ہیں وہ سب بیکار گئی ہیں۔ وادی کی آبادی کی عظیم اکثریت ہندوستان سے کوئی سروکار رکھنے کی روادار نہیں۔ (ملاحظہ ہو Sunday' ۱۳-۷ نومبر ۱۹۹۳' صفحہ ۳۵)۔ ایک اعلیٰ فوجی افسر کا بیان ہے کہ "ہم ان سے عددی قوت میں کہیں زیادہ ہیں۔ اسی طرح ہمارے پاس ان سے کہیں زیادہ بہتر ہتھیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی اچھی پٹائی کر سکتے ہیں۔ مگر کیا کریں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام مکمل طور پر ہماری انتظامیہ سے بے زار ہیں۔" ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس بھی یہی کہتا ہے کہ "عوام کی یہ بے زاری اور مغائرت ہماری اصل اور سب سے بڑی دشمن ہے۔ ہم یہ جنگ جیت ہی نہیں سکتے اگر ہمیں عوام کا تعاون حاصل نہیں" (ملاحظہ ہو India Today' ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳)۔ نہ صرف یہ کہ عوام ہمارے ساتھ نہیں بلکہ لوکل

انتظامیہ' مقامی کشمیری بیوروکریسی اور پولیس بھی ہم سے دُور ہو گئی ہے اور اس کی وجہ وہ بے اعتمادی اور شک و شبہ کی رَوِش ہے جس کا مظاہرہ ہندوستانی انتظامیہ مقامی انتظامیہ کے بارے میں اختیار کرتی ہے۱۵۔

ڈاکٹر منظور عالم معاشی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

چودہ سالہ افغان جنگ نے روس کی معیشت کو تباہ کر دیا۔ اور بالآخر روس کو افغانستان میں اپنی فوج کشی ترک کرنا پڑی اور فوجوں کو واپس بلانا پڑا۔ لیکن پھر بھی افغان جنگ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ روس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس میں ہمارے لیے بھی ایک سبق ہے۔ ہندوستانی افواج اور نیم فوجی دستے ایک نہایت مشکل مقام پر سخت نفسیاتی دباؤ کے تحت کام کر رہے ہیں۔ جنرل اشوک مہتا کے بقول "کشمیر میں ہمارے سیکیورٹی فورس میں جسمانی اور اخلاقی ہر دو اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ کا عمل اسی طرح جاری ہے جس طرح بدن سے سست رفتاری سے خون رسنے سے بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس فوجی اور انتظامی مشینری کی نااہلی نے مجاہدین (militants) کو ان پر نمایاں فوقیت حاصل کرنے کا موقع دیا ہے" (ملاحظہ ہو Sunday' ۱۸- ۱۲ ستمبر ۱۹۹۳)۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان نے ابھی تک ۴۰۰ سے ۶۰۰ بلین روپے کی ضروری اشیا کشمیر روانہ کی ہیں۔ محیّرالعقول اخراجات کے باوجود ہندوستان اور کشمیر کے بارے میں مستقبل کے امکانات روشن نہیں۔ کشمیر میں بغاوت کے نتیجے میں حکومت مجبور ہوئی ہے کہ نصف ملین فوجی اور نیم فوجی اس جنگ میں جھونک دے۔ دولت کے لیے فوج کی بھوک ناقابلِ تسکین ہے جبکہ ہندوستان بیرونی دنیا کا ۹۰ بلین ڈالر کے قریب مقروض ہے اور اس کا دو تہائی بس فوج کو چوکس رکھنے کے لیے صَرف ہوا ہے (ملاحظہ ہو Sunday' ۱۴ نومبر ۹۳)۱۶۔

اجیت بھٹاچاریہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

کشمیریوں کے پاکستان کے دو قومی نظریہ کو رَدّ کرنے اور ایک سیکولر جمہوری ہندوستان سے ناطہ جوڑنے سے جو ہمارا سر عزت و افتخار سے بلند ہوا تھا آج وہ شرم سے جھک گیا ہے۔ اس وقت وادی میں جن جذبات کا اظہار ہو رہا ہے ان کا مظہر بھارت کے خلاف کیے جانے والے مظاہرے ہیں۔ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ آج ہندوستانی سیکیورٹی فورسز وہی کردار ادا کر رہی ہیں جو آزادی کی جدوجہد کے دوران برطانوی فوج آزادی

کے متوالوں کے خلاف ادا کرتی تھی۔ ضروری نہیں کہ ایک عام کشمیری مسلمان عسکریت کے علمبرداروں کی سرگرمیوں کی حمایت کرے لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان سے نفرت اور بے اعتمادی کی حد تک ان کے ہم نوا ہیں۔ پاکستان نے اس بے چینی سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنا پورا زور لگایا ہے جیسا کہ اس نے ۱۹۴۷ سے اب تک کیا ہے' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس بے چینی کو پاکستان نے پیدا نہیں کیا۔ ہمیں خود اپنی پالیسیوں اور اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے تاکہ ہم یہ متعین کر سکیں کہ کہاں کیا خرابی پیدا ہوئی اور اس کا کس طرح تدارک کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ریاست جموں و کشمیر کو انڈین یونین کی باقی تمام ریاستوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان کا حصہ نہیں بنی جس طرح باقی علاقے ہندوستان کا حصہ بنے۔ وثیقۂ الحاق کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ہندوستان الحاق کو مستقل شکل دینے سے پہلے کشمیر کے لوگوں کی مرضی معلوم کرے گا[۱۷]۔

مسئلہ کے حل کا ذکر کرتے ہوئے اجیت بھٹاچاریہ کہتا ہے کہ:

> واحد راستہ جو مجھے نظر آتا ہے وہ تو یہی ہے کہ ہم کشمیر کے لوگوں سے اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کریں اور ان کو یہ موقع دیں کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ ہر وہ دن کہ فوجی حکمرانی کے تحت گزر رہا ہے اس بات کو یقینی بنا رہا ہے کہ وہ ہندوستان سے اپنے ربط و تعلق کو منقطع کر لیں گے[۱۸]۔

مندرجہ بالا اقتباسات کشمیر کی اصولی صورتِ حال کو سمجھنے اور خود ہندوستان کے دانشوروں اور سوچنے سمجھنے والے عناصر کے اضطراب اور بے چینی کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان سے یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کی تحریکِ مزاحمت اندرونی اسباب کی پیدا کردہ ہے اور اسے جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی عوامی تائید حاصل ہے۔ نیز یہ تحریک اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اب محض قوت سے اسے دبانا ممکن نہیں۔ کشمیر کے مسلمانوں نے ہندوستان سے اپنی نفرت کا برملا اظہار کر دیا ہے اور انھوں نے اس کی غلامی سے نجات کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے۔ اس سلسلے میں جو قربانیاں وہ پیش کر رہے ہیں وہ تاریخ کا ایک تابناک باب ہیں۔ لیکن اب اصل سوال یہ ہے کہ پاکستان اور عالمِ اسلام ان کی کس طرح مدد کرے۔ قربانیوں کی ایک حد ہوتی ہے' اور تاریخ گواہ ہے کہ جب ایک قوم یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اپنے ایمان' اپنی آزادی اور

اپنی عزت کے لیے جان قربان کرنے کو تیار ہے تو پھر کوئی دنیاوی قوت اسے غلام نہیں رکھ سکتی۔ لیکن قوت اور صلاحیت کا جو تفاوت ہندوستان کی عسکری مشین اور کشمیر کے تقریباً نہتے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس بہادر اور غیور قوم کی بھرپور مدد کی جائے تاکہ وہ کم سے کم وقت میں اپنے مقاصد حاصل کر سکے۔

کشمیر کے مسلمان آج صرف کشمیر کی جنگ ہی نہیں لڑ رہے وہ پاکستان کے تحفظ اور اس کی تکمیل کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں' وہ اسلام کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ پاکستان کے عوام اور پاکستان کی حکومت' امتِ مسلمہ اور مسلمان حکومتیں' ایک واضح کشمیر پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ کسی وقت ہم ان شاء اللہ پاکستان کی کشمیر پالیسی پر نظر ڈالیں گے' یہاں کی مقتدر قوتوں کی مصلحت کوشی' خود غرضی اور بے ہمتی پر مبنی طرزِ عمل پر بھی روشنی ڈالیں گے' اور ان اقدامات کی نشاندہی کریں گے جو اس تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ نیز ان خطرات پر بھی گفتگو کریں گے جو تحریک کو اس کے حقیقی مقاصد سے ہٹانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور جن کے لیے وہ اقوام اور ادارے سرگرم ہیں جو اسلامی احیا کو ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔

حواشی

۱۔ جنوری ۱۹۹۰ سے دسمبر ۱۹۹۳ تک ہندوستانی مظالم کا نشانہ بننے والوں کے بارے میں تحقیق شدہ اعداد و شمار یہ ہیں:

شہدا	۳۵'۰۰۰
زخمی' بشمول جو مستقل طور پر معذور ہو گئے ہیں	۴۰'۶۰۰
اسکول' مدرسے' مکان اور دوکانیں جو نذر آتش کی گئیں	۲۷'۴۷۰
وہ افراد جن کو زندہ جلایا گیا	۲'۱۰۰
خواتین جن کی اجتماعی بے حرمتی کی گئی	۴'۷۰۰
خواتین جو اجتماعی آبروریزی کے دوران شہید ہو گئیں	۲۱۰
خواتین جن کی لاشیں جہلم کے ذریعے پاکستان آئیں	۳۹۰
بھارت کی جیلوں اور تعذیب خانوں میں محبوس	۱۸'۰۰۰
جموں اور کشمیر کی جیلوں اور تعذیب خانوں میں محبوس	۲۴'۳۰۰

آزاد کشمیر آنے والے مہاجرین ۳۹٬۵۰۰

بحوالہ Facts File: Kashmir از بریگیڈیر محمد شفیع خان- انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۱۹۹۴-

۲- ملاحظہ ہو Alastair Lamb کی کتاب

"Kashmir: A Disputed legacy 1846-1990," Roxford Books, Hertingfordbury, 1991

اور. اسی مصنف کی تازہ ترین کتاب 'Birth of a tragedy: Kashmir 1947, مطبوعہ Roxford Books, 1994.

۳- شیخ محمد عبداللہ' "آتش چنار" چودھری اکیڈمی' لاہور' ص ۳۱۸-

۴- ایضاً' ص ۴۶-۵۴۵-

Kuldip Nayyar, "Kashmir: Cause or Consequence" The Radience, Delhi, 2-8 January. 1994. 5

A.G. Noorani "A Settlement for Kashmir", The Radience, Delhi, 5-11, Dec. 1993. 6

۷- ایضاً-

۸- ایضاً-

M.J. Akbar, "Kashmir Behind The Vale," Viking, Delhi, 1991, p. 183. quoted from Bhola Chatterjei's "Conflict in JP's Politics," Ankur, Delhi. 9

David C. Rapoport. "Terrorism", in Encyclopaedia of Government and Politics, ed. by Mary Hawkesworth and Maurice Kogen, Routledge, London and New York. 1992. vol. 2, p. 1062. 10

F.S. Northedge, "The Resort to Arms", in The Use of Force in International Relations, ed. by F.S Northedge, Faber and Faber, London, 1974, p. 13. 11

Ramesh Thakur, "India after nonalignment", in Foreign Affairs. vol. 71, No. 2, Spring 1992, p.170. 12

Khushwant Singh, "Kashmir and Human Rights." The Dawn, 30 Nov. 1993. 13

M.J. Akbar, "Kashmir Behind the Vale", pp. 213-223. 14

Dr. S. Manzoor Alam, "Kashmir: A Dream, Delhi demolished slowly", 15

Saudi Gazzette. 27 & 28 Feb. 1994.

۱۶۔ ایضاً ۲۸ فروری ۱۹۹۴۔

Ajit Bhattacharjia, "Kashmiris Must be Allowed to Decide Their Own 17
Future." The pioneer, 29 Oct. 1993.

۱۸۔ ایضاً۔